Courtesy www.pdfbooksfree.pk

I stood upon a high place,
And saw, below, many devils
Running, leaping,
And carousing in sin.
One looked up, grinning,
And said, " COMRADE ! BROTHER ! "

Stephen Crane

ان دنوں میں ہم اپنا اپنا کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے اور دوپہر کے وقفے میں سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ دفتر میں مجھ سمیت کل سات آدمی تھے: تین کلرک، ایک ڈسپیچر، ایک ٹائپسٹ، ایک چپراسی اور سب کے اوپر ایک ہیڈ کلرک۔ چنانچہ جب بارہ کا گھنٹہ بجتا تو ہم کام چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور دو میزوں کو جوڑ کر اپنے اپنے کھانے کے ڈبے ان پر لا رکھتے۔ پھر ہم پانچوں اپنی اپنی کرسیاں اُٹھا کر اُن کے گرد لے آتے اور بیٹھ کر کھانا شروع کرتے۔ جتنی دیر تک ہم کھاتے رہتے چپراسی پاس کھڑا مستعدی سے ہر ایک کو پانی پہنچاتا رہتا۔ وہ چپراسی مجھے اب تک یاد ہے۔ کلرک کے عہدے سے ترقی کرتے کرتے میں ڈپٹی سیکرٹری بن گیا ہوں اور اس دوران میں کوئی دو درجن چپراسیوں سے میرا واسطہ پڑ چکا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسا ذہین چپراسی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کو ہمارے بارے میں قطعی طور پر علم تھا کہ کون کون کھانے کے دوران میں کس کس وقت پر پانی پینے کا عادی تھا۔ مثلاً یہ کہ ٹائپسٹ اوسطاً ہر پانچ لقموں کے بعد آدھا گلاس پانی پیتا تھا اور یہ کہ ڈسپیچر ایک گلاس کھانا شروع کرنے سے پہلے اور ایک کھانا ختم کرنے کے بعد چڑھاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وہ، یہ ظاہر کیے بغیر کہ وہ ہمارا بغور مطالعہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہا ہے، باری باری ہر ایک کے پاس اُس کے مقررہ وقت پر بغیر مانگے ہوئے پانی کا گلاس لے کر پہنچ جایا کرتا۔ اپنے اس معمول پر وہ اس سختی سے عمل کرتا کہ اگر کوئی بلا توقع اس سے پانی مانگ بیٹھتا تو وہ اس کی طرف، اور پھر باری باری سب کی طرف، اس اچنبھے سے دیکھتا کہ مانگنے والا پانی پیے بغیر نادم ہو کر بات کو رفع دفع کرنے کی کوشش کرنے لگتا۔ اُس کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ گو میں نیا نیا دفتر میں نوکر ہوا تھا مگر چند ہی روز میں وہ میری اس عادت سے کہ میں کھانے کے ساتھ کبھی پانی نہیں پیتا بخوبی واقف ہو چکا تھا اور جب تک میں کھاتا رہتا میرے نزدیک بھی نہ پھٹکتا تھا ــــ وہ ہماری عادتوں کے مطابق کام کرتا تھا یا کہ ہم اُس کے کام کے مطابق اپنی عادات وضع کرتے تھے، اس بات کا میں کبھی فیصلہ نہ کر سکا۔ جب ہم کھانا ختم کر لیتے تو وہ سب ڈبوں کو بند کرتا، ان کو اُٹھا کر کونے میں رکھتا، میزوں کو جھاڑن سے صاف کرتا اور پھر باہر برآمدے میں جا کر اسٹول پر بیٹھ جاتا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنا کھانا کھاتا۔ وہ اپنا کھانا خوب چبا چبا کر کھاتا اور ہر لقمے کے بعد جھاڑن سے منہ پونچھ لیتا۔ مختصر یہ کہ مجموعی طور پر ہمارا چپراسی ایک قابلِ ذکر شخص تھا۔

ایک اور قابلِ ذکر بات جو میں چھوڑ گیا ہوں مندرجہ ذیل مکالمہ ہے جو کھانے کے دوران ہمارے درمیان ادا ہوتا:

"دیکھو بھئی دیکھو ــــ" کوئی کہتا۔

سب آنکھوں کے کونوں میں سے ایک طرف کو دیکھتے۔

"ہی ہی ہی ــــ" کوئی دبی دبی ہنسی ہنستا۔

"ہی ہی ہی ــــ" سب ایک ساتھ ہنستے۔ پھر کچھ دیر تک جبڑوں کی چپ چپ اور برتنوں کی کند آوازیں اُوپر آجاتیں۔

"ارے ہائے یار۔ کبھی تو بلا لو بیچارے کو۔" پھر کوئی کہتا۔

"ہاں یار۔ کسی روز یہ بھی تو کر کے دیکھیں ــــ"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جانے دے یار۔ ایسا آدمی ہے کباڑیا ــــ"

"بھئی بلانے کو تو کبھی نہ کبھی بلا ہی دیکھیں مگر یہ نظارہ پھر کہاں ملے گا م بیکار میں روز کا شغل گنوا دیں۔"

"اور جو بیکار میں روز کی بلا گلے پڑ گئی تو؟"

"ناں بھائی ناں ــــ" کوئی کانوں کو ہاتھ لگاتا، "یہ بلا ہم گلے نہیں لیتے۔ وہ اسی انتظار میں ہے کہ کوئی جھوٹ موٹ ہی مدعو کرے۔ ذرا اس کی شکل دیکھو ــــ"

پھر سب کنکھیوں سے اُدھر دیکھتے۔

"ہی ہی ہی ــــ"

"بیچارہ ــــ"

"یار ایک بات بتاؤ ــــ" کوئی حیرت سے پوچھتا، "یہ اتنی دولت کو لے کر کہاں جائے گا۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، نہ رَن نہ کُن اور سالا کھاتا پیتا بھی نہیں!"

"ارے بعضوں کی قسمت میں ہی کچھ نہیں ہوتا۔ جنم جنم کے ــــ"

"ارے رے رے دیکھو دیکھو ــــ"

"افوہ ــــ افوہ۔"

پھر جبڑوں کی چپ چپ اور دبی دبی ہنسی کی آوازیں اور پانی کی غٹ غٹ ــــ اور ایک دیوار کے پاس بیٹھا بیچارگی سے ہمیں تکا کرتا۔

"یار چندہ کر کے اس کے لیے الگ کھانا منگوا دیا کریں۔ ہیں؟" کوئی تجویز کرتا۔

"اور وصیت میں تمہارے لیے بہت کچھ چھوڑ جائے گا نا۔ واللہ۔"

"ہاہاہا ــــ واللہ۔"

"دیکھو دیکھو۔ ارے حد کرتے ہو یار۔ اب تو دیکھنے والا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہی ہی ہی ——"

یہ ہمارا ہیڈ کلرک تھا جس کے بارے میں، تھوڑے بہت ادل بدل کے ساتھ، یہ مکالمہ قریب قریب ہر روز دہرایا جاتا اور جس میں کلرکوں کے طبقے کی وہ ساری کوششیں شامل ہوتیں جن سے کہ وہ اپنے افسروں میں تضحیک کا پہلو نکال کر اپنی بہت سی ناآسودہ خواہشوں کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اس کی تھیلیوں والی آنکھیں اور راکھ کے رنگ کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جو وقت سے پہلے بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے سر پہ برف کی طرح سفید گھنے بال تھے جو اس چہرے پہ ایک خاص قسم کا، کسی حد تک پریشان کن اثر پیدا کرتے تھے۔ اس کا جسم مدقوق تھا اور ماتھے اور گردن اور بازوؤں پہ میلے نیلے رنگ کی رگیں اُبھری رہتی تھیں۔ اول تو وہ بات ہی بہت کم کرتا، اور جو بولتا تو ایسی آواز میں جو بہت دور کسی بند گنبد میں سے آتی ہوئی سنائی دیتی۔ سب سے پہلا خیال جو سُننے والے کو ہوتا وہ یہ تھا کہ یہ آواز اصلی نہیں نقلی ہے، یا اس کی اپنی نہیں بلکہ مستعار لی ہوئی ہے یا کہ اس آواز کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا ہے یا کیا، بہرحال کچھ نہ کچھ ضرور ہے جو کسی نہ کسی طور اُونچا نیچا ہے یا ٹیڑھا ہے مگر بے ڈھب ہے اور اس چہرے سے یا اس آدمی سے یا آس پاس کی کسی شے سے میل نہیں کھاتا اور دوسرے آدمی کو بے چین کرتا ہے خواہ مخواہ۔ ایسا اُس کی آواز کا اثر تھا اور ایسا اُس کے بات کرنے کا طریقہ تھا۔ یوں جیسے کوئی بات ہے جو اُس کے دل پہ آتی ہے اور چلی جاتی ہے، آتی ہے اور چلی جاتی ہے یا رک جاتی ہے یا روک دی جاتی ہے یا بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور رک رک کر، سوچ سوچ کر، جھک جھک کر اور گلے پہ ہاتھ پھیر پھیر کر اپنا مطلب بیان کرتا تو کر نہ پاتا اور آدھی پونی بات کر کے رہ جاتا اور دمے کے مریض کی طرح تیز تیز سانس لینے لگتا اور تھک کر کرسی کی پشت پہ ٹیک لگا لیتا اور نظریں پھیر لیتا۔ بعد میں تو میں اس کا عادی ہو گیا مگر جب میں نے پہلے پہل دفتر جانا شروع کیا تو یہ سوچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوچ کر اکثر حیران ہوا کرتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو محض ہم کلام ہو کر ہی اپنے مخاطب کے جسم میں سرد خون کی لہر دوڑا سکتے ہیں۔

وہ کبھی دوپہر کے وقفے میں کھانا نہ کھاتا تھا۔ سچ پوچھا جائے تو وہ کبھی دفتر کے اوقات میں کھاتا ہوا دیکھا نہ گیا تھا، اور دفتر کے باہر تو اس کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں پر رہتا ہے یا فارغ وقت میں کیا کرتا ہے۔ دوپہر کے وقت وہ صرف چائے کی ایک پیالی پیتا تھا جسے وہ چپراسی کے ہاتھ بارہ کا گھنٹہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے منگواتا اور اچھی طرح ٹھنڈی کر کے پیتا۔ اس کا چائے پینے کا طریق بھی اس کے بات کرنے کے طریق سے مختلف نہ تھا، بلکہ کچھ اور بھی زیادہ انوکھا تھا، اس لیے کہ اس وقت اس کی شخصیت کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو نمایاں ہو جاتا۔ بلا ناغہ یہ ہوتا کہ ہم سب لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور وہ چائے کی پیالی آگے دھرے ہماری طرف ندیدے پن سے دیکھ رہا ہے، دیکھ رہا ہے، چائے کی پیالی کو اٹھاتا ہے اور کبھی اسے سونگھ کر اور کبھی اس میں اپنا عکس دیکھ کر اور کبھی اسے لبوں سے چھو کر اور کبھی محض گھما کر واپس رکھ دیتا ہے اور دوبارہ ہمیں اور ہمارے کھانے کو ندیدی نظروں سے ایک ٹک دیکھنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کے فاقہ زدہ چہرے پر ایک عجیب ناقابلِ بیان گرسنگی اور حسرت ہوتی جو اوپر قلمبند کیے گئے ہمارے مکالمے کی تشریح کرتی ہے۔ پھر جب ہم منہ چھپا کر ہنس رہے ہوتے یا پانی پی رہے ہوتے تو وہ جلدی سے پیالی کو اٹھا کر چائے حلق میں انڈیل لیتا۔

لیکن ان ساری باتوں کے علاوہ — اور ان کے باوجود — اس میں ایک چیز تھی جو عموماً بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اور جس نے کہ اس کو، دنیاوی لحاظ سے، مکمل طور پر فیل ہونے سے بچا رکھا تھا۔ یہ چیز اس کی ذاتی خود مختاری اور اس کی شخصیت کا وقار تھا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک ایسی چیز، جیسی کہ یہ ہے، اس شخص میں موجود ہو جس کا کہ تفصیلاً ذکر میں نے اوپر کیا ہے، لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ حقیقت تھی کہ جب تک وہ ہم لوگوں کو دور دور سے دیکھتا رہتا اس کی آنکھوں میں حسرت اور بیچارگی اور کم مائگی کی کیفیت رہتی مگر جونہی وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتا اس میں غرق ہو جاتا، اس کے ساتھ ایک ہو جاتا اور قلم کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اور اس کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے کو اور کبھی میز کو بجاتے ہوئے وہ کسی بہت بڑے اخبار کے بہت بڑے مدیر کی طرح لگتا جو کوئی عظیم اداریہ لکھ رہا ہو، اور اس وقت کاغذات پر نظریں جمائے جمائے جو وہ کوئی ہدایات ہمیں ان کے بارے میں دیتا ان میں تحکمانہ کھنک ہوتی اور جس خود مختاری سے وہ کام میں مدد کرنے کی ہماری ہر پیش کش کو رد کر دیتا وہ حیرت انگیز ہوتی۔ وہ قلم کا دھنی تھا اور جس ڈرافٹ کو وہ ایک مرتبہ تیار کر لیتا پھر سیٹنو سے لے کر سیکرٹری تک کوئی اسے نہ بدل سکتا نہ اس کا جواب دے سکتا۔ اپنی میز اور فائلوں کی مختلف الماریوں کے درمیان اس کا دبلا پتلا اپنے آپ میں کھویا ہوا جسم جنگل کے جانور کی ایسی آسانی، پھرتی اور وقار کے ساتھ حرکت کرتا۔ کاغذوں، فائلوں، میزوں، کرسیوں اور الماریوں کے ساتھ اس کا تعلق اس قدر آسان اور قدرتی سطح پر تھا کہ اس میں خوبیِ کار کے علاوہ خود بخود ایک گریس پیدا ہو گئی تھی جو ہمیں اس کی عزت کرنے اور کسی حد تک اس سے ڈرنے پر مجبور کرتی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے — کہ نیا نیا کلرک بنا تھا اور ابھی اس طبقے کی اس مخصوص ذہنیت سے بچا ہوا تھا جو کہ اسے کسی بھی نئے ذہنی تجربے یا تجسّس کے قابل نہیں رہنے دیتی — اُس سے بے لاگ دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ گو مجھے چند روز کے بعد ہی اس دفتر کی نوکری چھوڑنا پڑی اور اس کی شخصیت کے معمّے کو حل کرنے کی خواہش کو میں دل ہی میں لے کر چلا آیا اور یوں یہ بات میری ان متعدد خالصتاً ذہنی ناآسودگیوں میں شامل ہو گئی جن سے ایک سوچنے والے انسان کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔

لیکن ان چند روز میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے کہ بعد میں — بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد میں ـــــ اس گتھی کے سلجھانے میں میری مدد کی۔ یہ واقعہ میرا اُس کے ہمراہ اس کے گھر جانے اور ایک گھنٹہ اس کی صحبت میں گزارنے کا تھا۔ یہ یوں ہوا کہ ہمارا چپراسی چھٹی پر تھا اور ہیڈ کلرک کو معمول سے زیادہ فائلیں گھر لے جانے کی ضرورت پیش آگئی اور چونکہ ایک خاص مقدار سے زیادہ کا بوجھ اس کا ناتواں جسم اُٹھانے کے قابل نہیں تھا چنانچہ اُس نے مجھ کو، کہ سب سے جونیئر تھا، فائلیں اُٹھا کر ساتھ چلنے کا حکم دیا۔

اُس کا گھر نسبتاً غیر آباد علاقے میں واقع تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں شہر بھر کا چکر کاٹنا پڑا۔ میں گو کہ جوان آدمی تھا اُس کی رفتار کا مقابلہ نہ کر سکا اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہانپ گیا۔ جب میں نے سانس برابر کرنے کے لیے فائلوں کا بوجھ اس کی سیڑھیوں پر پٹکا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا دم اتنا بھی نہ پھولا تھا جتنا کہ پل کے پل کو کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے سے پھول جایا کرتا تھا۔ جب ہم تالا کھول کر اندر داخل ہوئے تو اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ مکان میں پہنچتے ہی سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ جانور تھے۔ ڈیوڑھی سے لے کر صحن اور اس سے آگے برآمدوں اور سیڑھیوں اور چوباروں تک سارا مکان پالتو چوپاؤں اور پرندوں سے اٹا پڑا تھا۔ سب سے پہلے دو درمیانے قد کے بلڈاگ کتوں نے بھاگتے ہوئے آکر ہمارا استقبال کیا اور اگلی ٹانگیں اس کی رانوں پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر برآمدے میں لٹکے ہوئے پنجرے میں سے طوطے نے 'خوش آمدید' کہا۔ پھر ساتھ کے پنجرے سے مینا کچھ بولی جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کھاٹ پر سے ایک ننھا سا سفید کتا، جس کا چہرہ بالوں میں چھپا ہوا تھا، جماتی لے کر اُٹھا اور بڑی نفاست سے قدم رکھتا ہوا آکر اُس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ برآمدے کے کونے میں ایک بڑے سے پنجرے میں رنگ برنگی چونچوں اور رنگ برنگے پروں والی ننھی بیسیوں چڑیاں تھیں جو ہمیں دیکھ کر پاگلوں کی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر ایک سمت میں اُڑنے اور گرنے اور پنجرے کے تاروں سے لٹکنے اور لبساط بھر شور مچانے لگیں۔ دوسرے کونے میں ایک اس سے ذرا چھوٹا پنجرہ دھرا تھا جس میں بند ایک پالتو نیولا اپنی تھوتھنی اُٹھا کر تیزی سے اُوپر نیچے چکّر لگانے لگا۔ جب کمرے کا دروازہ کھول کر ہم اندر داخل ہوئے تو سیاہ اور سفید بلیوں کا ایک جوڑا میز سے کود کر میاؤں میاؤں کرتا ہوا بڑھا اور پاس آ کر اس کی ٹانگوں سے جسم رگڑنے لگا۔ وہ ہر ایک کو اس کے مزاج کے مطابق چھیڑتا، تھپکتا، کان مروڑتا، پاؤں میں دباتا، ہاتھوں میں اٹھاتا یا دور سے ہاتھ ہلاتا، مسکراتا اور انہیں ان کے عجیب و غریب ناموں سے پکارتا ہوا سیدھا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

"بیٹھو ——" اُس نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ پھر وہ کوئی اور بات کیے بغیر فائلوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ آدھی درجن چوپائے اس کے ارد گرد ننگے فرش پر اور کرسیوں پر بیٹھے تھے اور وہ بالکل ایسے جیسے دفتر میں کام کیا کرتا تھا، قلم کے دوسرے سرے سے کبھی ماتھے اور کبھی میز کو بجاتا ہوا کام میں گم تھا۔ صرف دو باتیں ایسی تھیں جنہوں نے کہ مجھے ذرا سا پریشان کر دیا۔ ایک تو یہ کہ کام کے دوران وہ برابر وقفے وقفے پر اپنے پالتوؤں کے نام لے لے کر باتیں کرتا جا رہا تھا، بڑے آسان، قدرتی طور پر، جیسے لوگوں سے باتیں کی جاتی ہیں، ان کے حال احوال پوچھ رہا تھا، ان کی ذرا ذرا کوتاہیوں اور بدتمیزیوں پر سرزنش کر رہا تھا اور بیچ بیچ میں ہاتھ بڑھا کر کسی ایک کو چھُو بھی لیتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ظاہری طور پر اس نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

آخر میں تنگ آ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر بھی اس نے ادھر توجہ نہ دی تو میں پیٹھ پہ ہاتھ باندھ کر بے مقصد کمرے میں پھرنے لگا۔ کمرے میں سوائے ایک درجن میز کرسیوں کے، جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور کچھ نہ تھا۔ صرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مغربی دیوار پر تین تصویریں لٹک رہی تھیں جن پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی ۔ مَیں نے کنکھیوں سے گھر کے مالک کو دیکھا اور آہستہ سے پھونک مار کر ان کی گرد اُڑائی ۔ پہلی تصویر ایک سیب کے سے گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے صحت مند نوعمر لڑکے کی تھی جو سکاؤٹوں کی وردی پہنے ایک پہاڑی نالے کے کنارے کھڑا ہنس رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نوعمری کے زمانے کا جمال تھا اور آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے اور اس کی مسکراہٹ میں ایک ایسی کشش تھی جس نے مجھے کتنی ہی دیر تک اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری تصویر ایک نوجوان آدمی کی تھی جو سیاہ گاؤن پہنے، ڈگری ہاتھ میں پکڑے بڑے اعتماد سے کھڑا تھا۔ سب سے گہرا تاثر جو اس کے چہرے پہ تھا اس کی پُرعزم نگاہوں کا تھا۔ وہ ایسے نوجوانوں میں سے تھا جو ستاروں پہ کمند ڈالتے ہیں۔ تیسری تصویر چند فوجیوں کی تھی جو جنگی لباس میں ملبوس کسی نامعلوم مقام پر ایک فوجی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ بائیں طرف کو گروپ سے ذرا ہٹ کر ڈھلتی ہوئی عمر کا ایک شخص، جو بہر حال گروپ میں شامل تھا، رائفل کی ٹیک لیے تھکے ہوئے انداز میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی اکتاہٹ اور درماندگی مترشح تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی مشابہت اس شخص سے تھی جو اس وقت اس کمرے میں فائلوں پر جھکا ہوا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ تینوں تصویروں پر سوائے سن اور تاریخ کے اور کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ پہلی اور دوسری تصویر میں تیرہ سال کا فرق تھا، دوسری اور تیسری میں صرف چھ سال کا تھا۔ تصویروں کو دیکھتے دیکھتے مجھے اچانک خیال ہوا کہ ہیڈ کلرک بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ جب میں مڑا تو وہ اسی طرح کام میں مصروف تھا۔ میں واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ کمرے کا فرش اور فرنیچر صاف شفاف تھا لیکن چاروں طرف ایک ایسی سرد اور نامانوس بُو پھیلی ہوئی تھی جیسی خانقاہوں میں، یا پرانے کنوؤں میں ہوتی ہے۔ اس بُو سے، اور پالتو جانوروں کی اجنبی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اجنبی نگاہوں سے مجھ کو اندازہ ہوا کہ اس گھر میں گھر کے مالک کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا گزر کم ہی ہوتا ہے۔

آخر تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد اس نے تقریباً ایک درجن فائلوں سے نپٹ کر انہیں تہہ کیا اور ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ چائے بنائیں۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔

برآمدے میں رُک کر اس نے طوطے کی کسی بات کا جواب دیا۔ پھر میں اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں داخل ہوا۔

"بیٹھو۔" اس نے کہا۔

سارے گھر میں یہی ایک جگہ تھی جہاں کا فرش گندا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کونے میں سے برش اُٹھا کر صفائی کی۔ اس دوران میں وہ برابر اپنے کتوں اور بلیوں کو، جو ہمارے ساتھ ساتھ باورچی خانے میں چلے آئے تھے، دھیمے لہجے میں ڈانٹتا ڈپٹتا اور مختلف ہدایات دیتا رہا۔ پھر سٹوو جلا کر اس پر پانی رکھنے کے بعد اس نے شیلف پر سے چائے کا سامان اور برتن اُتارنے شروع کیے۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اُس پر اُس نے نفاست سے دو پیالیاں، چمچے اور چینی دان رکھے۔ کرسی صرف ایک تھی چنانچہ وہ بڑے کمرے سے جا کر ایک اور کرسی اُٹھا لایا۔ پانی اُبل گیا تو اس نے چائے دم کی، دودھ گرم کر کے برتن میں ڈالا اور پھر میز پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ اس سارے عرصے میں مَیں تقریباً مسحور بیٹھا اسے دیکھتا رہا تھا۔ وہ گھر کے کام میں بھی اسی طرح غرق تھا جیسے دفتر کے کام میں ہوا کرتا تھا اور یہ کام بھی وہ اسی طرح اپنے نچلے انداز میں اسی یقین اور خوبی اور خود مختاری اور صفائی سے کر رہا تھا جیسے کہ وہ کام، اور یہاں بھی وہ اپنے کتوں بلیوں طوطوں اور کھانے کے برتنوں کے درمیان اسی جنگل کے جانور کی ایسی آسانی اور پھرتی اور گریس کے ساتھ حرکت کر رہا تھا جیسے دفتر میں میزوں، کرسیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور فائلوں کی الماریوں کے درمیان کیا کرتا تھا۔ ہماری کرسیاں آمنے سامنے نہ تھیں۔ اپنی کرسی اُس نے اس طرح رکھی تھی کہ میرا رُخ شمال کی جانب تھا اور اس کا مغرب کی طرف۔ ہم نے خاموشی سے بیٹھ کر ایک ایک پیالی چائے پی۔

چائے پینے کے بعد اُس نے شیلف پر سے ایک بہت بڑا کھلے منہ والا برتن، جس میں ڈبل روٹی اور تیندوری روٹی کے ٹکڑے بھگوئے ہوئے تھے، اتار کر تینوں کتوں کے آگے رکھا۔ پھر ایک بڑے سے کٹورے میں دودھ ڈال کر بلیوں کو دیا۔ پھر اس نے ڈبے میں سے معجون نما ایک چیز نکالی اور اس کے دو حصّے کر کے طوطے اور مینا کے پنجروں میں ڈالی۔ اُس کے بعد اُس نے چڑیوں کے پنجرے میں باجرے کے دانے پھینکے اور پانی کی پیالیوں کو بھرا۔ پھر اس نے نیولے کا پنجرہ کھول کر اس کو باہر نکالا، پنجرے کے اُوپر سے ایک چھوٹے سے چمڑے کے پٹے کو اٹھا کر اس کی گردن میں ڈالا، اس میں پتلی سی زنجیر پھنسائی اور زنجیر کے سرے کو پکڑ کر سیڑھیوں کی جانب چل پڑا۔ نیولا کبھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا، کبھی چھلانگ لگا کر اس کے جسم پر چڑھنے لگتا اور کندھے پر جا کر بیٹھ جاتا۔ ہم آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے چوبارے پر نکل آئے۔

یہاں پر عجیب منظر تھا۔ چاروں طرف کبوتروں کی کابکیں ہی کابکیں تھیں جو ایک دوسرے کے اُوپر رکھی چھت کو پہنچ رہی تھیں۔ جہاں کھلی چھت تھی وہاں اُونچی اُونچی مچانیں کبوتروں کے لیے لگی تھیں۔ کبوتروں کی خشک بیٹوں سے فرش بدرنگ ہو رہا تھا اور کابکوں کے اندر وہ غٹرغوں اور چوں چوں کا شور مچا رہے تھے اور ان کی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے اس نے کابکوں کے دروازے اُٹھانے شروع کیے اور کبوتر پھڑ پھڑا کر نکلنے لگے۔ چند ایک تو نکلتے ہی اس کے کندھوں پر اور سر پر بیٹھ گئے۔ باقی اُڑ کر مچانوں اور دیواروں پر جا بیٹھے۔ کچھ فرش پر بیٹھ کر پروں میں چونچیں پھیرنے لگے۔ ساری کابکیں کھول کر جب وہ لوٹا تو تقریباً ڈیڑھ سو کبوتر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر قسم کے اور ہر رنگ کے ہمارے ارد گرد موجود تھے۔ پھر اس نے ان کے پانی کے برتن بھرے اور ان کو دانہ پھینکنا شروع کیا۔ مچانوں اور دیواروں اور اس کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے کبوتر غوطہ لگا کر دانے پر ٹوٹ پڑے۔ اب یہ منظر تھا کہ رنگ رنگ اور نسل نسل کے ڈیڑھ سو کبوتر مستقل غٹرغوں کرتے اور ایک دوسرے کو چونچیں مارتے ہوئے دانہ چگ رہے تھے اور وہ ان میں کھویا ہوا درمیان میں کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بے نام سی مسکراہٹ تھی اور بنولا اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا۔

کتنا ہی وقت گزر گیا اور وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ میں ایک بار کھنکارا، پھر دوسری بار، پھر تیسری بار۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"میں اب جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر فوراً منہ پھیر لیا، جیسے کہ میری موجودگی کی اطلاع پا کر اس کو اچانک صدمہ ہوا ہو۔

"یہ کبوتر"، اس نے سنبھلتے ہوئے کہا، "تمہیں پسند ہیں۔"

"ہاں۔"

اس نے جھک کر بادامی رنگ کے سروں والے نہایت خوبصورت کبوتروں کا ایک جوڑا اٹھایا۔

"یہ تم لے لو۔" اس نے کبوتر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ن — نہیں۔" میں نے کہا، "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

اس نے آہستہ سے کبوتر چھوڑ دیے جو گرتے ہی دوبارہ دانہ چگنے لگے۔

"اتنے جانور — آپ نے کیوں رکھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جانور؟" وہ بے خیالی سے بولا، "ہاں۔ اچھے ہوتے ہیں۔"

"اچھے ہوتے ہیں؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آہستہ سے ہنسا۔ اُس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ میں پریشان ہو گیا۔

"ان کا فایدہ ؟" میں گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

"فایدہ ؟" وہ پہلی بار ہنسا، گہرا اور مختصر۔ پھر اُس نے جھک کر سفید کبوتروں کا ایک جوڑا اُٹھایا اور اُنہیں چہرے کے قریب لا کر پیار سے بولا، "جب چاہو انہیں بلا سکتے ہو۔ چھو سکتے ہو۔" پھر اُس نے کبوتر میری طرف بڑھائے۔ "یہ لے لو۔"

میں خاموش کھڑا رہا۔

"لے لو۔" اُس نے کہا، "یا کوئی اور لے لو۔ جو بھی تمہیں پسند آئیں۔ یا طوطا لے لو۔ یا مینا۔ یا کتا لینا چاہتے ہو؟ چھوٹا کتا تم کو پسند ہے؟ وہ لے لو۔"

میں ہچکچاتا ہوا خاموش کھڑا رہا۔ اس نے پہلی بار سیدھا میری آنکھوں میں دیکھا اور آہستہ سے بولا: "لے لو!" پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے ہلتا اُس میں ایک عجیب تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کی نظریں واضح طور پر لڑکھڑائیں، اور پھر جیسے ٹوٹ گئیں۔ اس نے جلدی سے کبوتر پھینکے اور بچتا بچاتا ہوا نیچے اُتر گیا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ ان ایک درجن فائلوں کو، جن سے نپٹ چکا تھا، جلد جلد باندھ رہا تھا۔ پھر اس نے ان کا بنڈل میری طرف بڑھایا اور رُک رُک کر، گلے کی رگوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر چند الفاظ میں مجھے سمجھایا کہ میں ان کو گھر لے جاؤں اور اگلی صبح دفتر لے آؤں۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ میں نے فائلیں بغل میں دبائیں اور چپکے سے چلا آیا۔

اگلی صبح اُس نے کوئی ایسی بات یا ایسی حرکت نہ کی جس سے ظاہر ہوتا کہ ہم میں کوئی صحبت رہ چکی ہے۔ دوپہر سے پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جڑوں کی چپ چپ اور دھیمی دھیمی باتیں اور دبی دبی ہنسی اور پانی کی غٹ غٹ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ایک بیچارہ دیوار کے پاس بیٹھا ہمیں تکا کرتا۔ چند روز کے بعد میں نے بہتر ملازمت مل جانے کی بناء پر دفتر سے استعفیٰ دے دیا۔

کئی برس گزر گئے اور میں اس واقعے کو تقریباً بھول گیا۔ مگر پھر ایک بار مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں تہران جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میرا قیام چند روز سے زیادہ کا نہ تھا مگر اپنی بیوی کے اصرار پر مجھے اس کو بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ وہاں پر ایک روز ایک ریستوران میں کھانا کھاتے ہوئے ہم نے ایک بہت بوڑھے شخص کو دیکھا جو عجیب حسرت بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ کھاتے پیے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا اور چھڑی ٹیکتا اور مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے ریستوران کے ایک بیرے سے، جس سے اس نے چند باتیں کی تھیں، اس کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ شہر لاہور کا رہنے والا تھا جو اپنی جوانی میں وہاں آیا تھا اور پھر واپس نہیں گیا۔ اس نے وہیں پر شادی کر لی تھی اور اب تہران کے متموّل تاجروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس پر مجھے یہ واقعہ یاد آگیا جو اوایل عمر میں میرے پیش آیا تھا، اور چشم زدن میں — یوں کہ جیسے ہم طوفانی رات میں کہیں جا رہے ہوں اور ایک جگہ ایک سیاہ شبیہہ کو دیکھ کر رک جائیں اور کھڑے رہیں اور دل میں ڈرتے رہیں کہ یکبارگی بجلی چمکے اور ہم پر انکشاف ہو کہ ارے یہ تو ایک جھاڑی تھی اور ہم بے خوفی سے گزر جائیں — یوں چشم زدن میں مجھ پر ساری بات واضح ہو گئی اور یہ معمہ، جس کو میں بظاہر بھول چکا تھا اور جو دراصل برابر میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اٹکا رہا تھا اور برابر غیر محسوس طور پر میری ذہنی ناآسودگی میں اضافہ کرتا رہا تھا، دفعتاً جیسے نکل کر باہر آگیا اور جیسے بڑی صفائی سے حل ہو گیا اور میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا کر بڑی طمانیت سے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا جو ابھی تک کھانے میں مصروف تھی اور میری آسودگی سے تقریباً

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے خبر تھی۔ اس وقت جو چند لمحے مجھ کو خالی ملے ان میں مَیں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ بعض دفعہ ایک چھوٹی سی بات کے جاننے میں ایک عمر لگ جاتی ہے، کہ جلاوطن اپنے قبیلے کی کشش سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا چاہے وہ اپنے قبیلے سے مایوس ہی کیوں نہ ہو چکا ہو ـــــ کیسی عجیب بات ہے۔

جب ہم بل ادا کر کے باہر نکلے تو میری بیوی ابھی تک اس بات سے بے خبر تھی کہ آج مَیں اس برسہا برس پرانے واقعے کو قطعی طور پر اپنے پیچھے اس ریستوران میں چھوڑے جا رہا تھا جس میں ابھی ابھی ہم نے کھانا کھایا تھا اور جہاں ابھی تک دوپہر کو دیر سے کھانا کھانے والے اکا دکا لوگ بیٹھے تھے اور جہاں سے کچھ دیر ہوئی کہ وہ بڈھا ہم وطن اُٹھ کر گیا تھا جو میرے لیے طوفانی رات میں بجلی کا چمکارا ثابت ہوا تھا، اور کہ اب میرے لیے اس بات کا کُلّی طور پر بھول جانا کس قدر آسان ہو چکا تھا۔

+++

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندی

(افسانہ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی ابھی باٹرن کا خط آیا ہے اور مجھے ساری بات یاد آگئی ہے۔ دو برس پہلے کی بات جواب بھولتی جا رہی ہے۔ وقت کا ظلم اس طرح سے ہمارے ذہن کی تسخیر کرتا ہے اور اس طرح دل کی منزل کا پتا گم ہوتا ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ منزلوں کا کوچ ہے جو فراموشی کی طرف رواں ہے اور یہ ہماری یاد کی رحم دلی ہے کہ منزل منزل پر ہمارا ساتھ چھوڑتی رہتی ہے۔ سارے وقتوں کی یاد کو لے کر ہم نہ چل سکتے ہیں نہ مستقبل کے اندھیروں میں شریک ہی ہو سکتے ہیں۔

یہ خزاں کی بڑی پُرامن اور شفاف سہ پہر ہے اور میں اپنے گھر کے سامنے نہر کے پل پر بیٹھا ہوں۔ گھر کے برآمدے میں مجھے وہ میز نظر آ رہی ہے جس پر صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے تمام خط کھلے پڑے ہیں، سوائے اس ایک خط کے جو میں نے تہہ کر کے قمیض کی جیب میں رکھ لیا ہے اور بار بار سینے پر ہاتھ پھیر کر قمیض کے اندر نفیس کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ کو محسوس کر رہا ہوں اور اسے دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں مگر نہیں پڑھ سکتا کیونکہ خزاں کی زرد دھوپ میں بڑا امن ہے، اور پانی کے بہنے میں اور دور دور تک ندی میں خشک پتے گراتے ہوئے زرد درختوں میں اور درختوں کے بیچ تھمی ہوئی ہوا میں اور نیچے زرد رنگ کے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے کسان میں ایک ایسا پُرسکوت، پُرامن سحر ہے جو صرف خزاں کے موسم میں ہوتا ہے اور سہ پہر کے وقت میں ہوتا ہے اور جس میں کسی بدامنی، کسی خلل اندازی کی ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے۔ وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ دنیا کا سب سے رقت انگیز، سب سے دل گداز منظر کسان کے زمین میں ہل چلانے کا ہے۔ غالباً کوئی مصور تھا۔ میں ایک بار پھر خط کو سینے کی جیب میں محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتا ہوں۔ میرے عین نیچے پانی میں دور دراز کے منظر، گمشدہ محبوب چہرے بہتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ وقت کا ظلم تھمتا جا رہا ہے۔ ندی، میری عزیز دوست، اب میں تم سے مخاطب ہوتا ہوں۔

مغربی کینیڈا کی اس چھوٹی سی پہاڑی یونیورسٹی میں پہنچے ہوئے مجھے دوسرا دن تھا۔ سارا وقت بارش ہوتی رہی تھی۔ سہ پہر کے وقت ذرا کی ذرا کو بارش تھمی اور بادل پھٹ گئے۔ میں اکتا کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ڈھلی ڈھلائی ہوئی سیمنٹ کی کشادہ سڑکوں پر کہیں کہیں موٹر گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی چھتوں پر میپل (Maple) کے زرد اور قرمزی پتے گرے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کار کے انجن پر چند لڑکے جھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر اُٹھا کر اپنے مخصوص دوستانہ لہجے میں ہیلو کیا۔ آگے لڑکیوں کا ہوسٹل تھا۔ سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی چند لڑکیوں نے مجھے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ آگے یونیورسٹی کا گرجا تھا جس میں سے نکلتے ہوئے نوجوان پادری نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔ اُس کے پیچھے پیچھے ڈائننگ ہال کا بڈھا بیرا جم دودھ کی ایک خالی بوتل ہاتھ میں لٹکائے چلا آتا تھا۔ اس نے پائپ منہ سے نکالے بغیر میرا حال پوچھا اور گزر گیا۔ کیمپس پر ڈین کے علاوہ یہی ایک شخص تھا جس سے اب تک میری واقفیت ہو سکی تھی۔ سردی یک لخت بڑھ گئی تھی۔ ہوا کے زور سے میپل اور پائن کے درختوں پر رُکے ہوئے بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ میں نے سردی سے بچنے کے لیے کوٹ کا کالر اُٹھایا اور کومن روم کی طرف چلا گیا جو شام تک کھلا رہتا تھا۔

کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اور باہر بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ میں سبز رنگ کے بے آواز قالین پر ادھر اُدھر پھرتا اور کتابوں پر نظر ڈالتا رہا۔ میزوں پر اخبار اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔ ہال میں کتابوں اور میزوں اور کرسیوں کی مخصوص بُو رکی ہوئی تھی۔ جیبوں سے ہاتھ نکالے بغیر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے چند رسالوں کے سرورق دیکھے، ایک میز پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے کا ارادہ کیا، پھر دل ہی دل میں اس خیال کے بے ڈھنگے پن پر ہنسا اور ایک بڑے سے دریچے کے آگے جا کھڑا ہوا۔ بند شیشوں پر سر مارتے ہوئے بارش کے قطرے ہلکی ہلکی گوند آواز پیدا کر رہے تھے۔ پرے پیپل کے درختوں پر سے زرد اور سرخ اور سرمئی پتے، جن کا وقت پورا ہو چکا تھا، بھاری تعداد میں نیچے آ رہے تھے اور بارش کے پانی میں تیر رہے تھے اور بہہ رہے تھے اور چکر کھا رہے تھے۔ پرے گرجا گھر کی مخروطی چھت آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ پرے سیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس سے پرے کہیں میرا وطن تھا، کئی ہزار میل پر، میں نے سوچا۔ بیچ میں سمندر پڑتے تھے۔

"بند دریچوں کے باہر بارش بڑی عجیب لگتی ہے۔" کسی نے کہا۔

بہت آہستہ آہستہ میں اپنی سوچ میں سے نکل آیا۔ چند لحظے تک آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑے رہنے کے بعد میں چونک کر مڑا۔ یہ ایک لڑکی تھی جو میری طرف لشت کیے ایک رسالے پر جھکی ہوئی تھی۔ بظاہر اس نے یہ الفاظ اپنے آگے پڑے ہوئے پرچے سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ اس نے سُرخ رنگ کی بھاری سی اونی سویٹر پہنی ہوئی تھی اور آنکھوں پر پڑھنے کا چشمہ چڑھا رکھا تھا۔

"مجھے یوں لگتا ہے ــــ" جھکے جھکے اُس نے کہنا شروع کیا، پھر وہ مڑی اور سیدھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی، "جیسے کوئی راہ گیر ناگہانی آ نکلا ہو اور ہمارے دروازے پر کھڑا ڈری ڈری دستک دے رہا ہو۔"

"دکھوں ہوں ــــ" میں نے گلے میں سے ملی جلی تائیدی آواز نکالی۔ اُس کی آنکھیں اور بال شہد کی رنگ کے تھے۔

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تمہیں بھی ایسا لگتا ہے؟"

"مجھے؟" جواب کی تلاش میں میں نے دوبارہ حلق سے غیر یقینی، مگر شائستہ آواز پیدا کرنے کی کوشش کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم کہاں سے آئے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ــــ"

"ٹھہرو ٹھہرو ــــ" وہ بات کاٹ کر بولی، "مجھے بوجھنے دو۔ اررر ــــ سپین؟"

"اوں ہنک!"

"نہیں؟" وہ اداس ہوگئی۔ "سپین سے تمہاری طرح کے لوگ آتے ہیں۔ سپین سے میرو بھی آیا تھا۔ دو سال ہوئے۔ میری اُس کی بڑی دوستی تھی۔"

"پھر؟"

"اب وہ جا چکا ہے۔ بتاؤ کہاں سے آئے ہو؟"

"کسی اور ملک کا نام لو۔"

"نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ تم سپین سے تو نہیں آئے۔ بتاؤ۔"

میں نے اُسے اپنے ملک کا پتا بتایا۔

"میرا نام بلانکا ہے۔" وہ پھر مڑ کر بیٹھ گئی۔ "میں ماہرِ لسانیات ہوں۔"

اُس نے خوش دلی سے کہا اور اس کے سفید ہموار دانت ہنسی میں کھل گئے۔ "یعنی یہ کہ میں لسانیات کی طالب علم ہوں۔ سینیئر۔ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اپنا نام بتایا، اور یہ کہ فزکس میں ریسرچ کرنے یہاں آیا ہوں۔

"ریسرچ سکالر؟" اُس نے بھویں اٹھائیں۔ "شکل سے تو تم جغرافیے کے جونیئر دکھائی دیتے ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "خیر فزکس بھی بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ مگر لسانیات کی کیا بات ہے۔ اب اسی رسالے کو لے لو۔ اس کے سر پیر کا علم بھی تم نہیں رکھتے۔ رکھتے ہو؟"

میں نے قریب جا کر سنجیدگی سے اُس اجنبی زبان کے حروف کو پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ ہنس پڑی۔